نام کتاب : تعلیم اور تہذیب وثقافت کے رشتے
مصنف : منیراحمد خلیلی
ناشر : ادارہ مطبوعات سلیمانی،غزنی سٹریٹ،اردوبازار،لاہور
سن اشاعت : اگست ۲۰۰۲ء
صفحات : ۱۷۶
قیمت : ۱۵۰روپے
تبصرہ نگار : حافظ مبشرحسین☆

آج کی مہذب دنیا میں تعلیم و تعلّم کی اہمیت سے کسی بھی صاحبِ شعور کو انکار نہیں۔ تعلیم ہی کے ذریعے انسان کو انسان بنایا اور زیورِ اخلاق سے آراستہ کیا جاتا ہے۔ تعلیم ہی انسان کو اپنے فرائض کی انجام دہی اور دوسروں کے حقوق کی پاسداری کے فریضہ سے روشناس کرتی ہے۔ تعلیم ہی انسان کو رواداری، حوصلہ و برداشت اور اَمن و آشتی کا درس دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ تعلیم انسان کو تہذیب سکھاتی اور مہذب وبااَخلاق بناتی ہے لیکن اگر تعلیم و تعلّم کے باوجود انسان میں یہ اعلیٰ صفات پیدا نہ ہوں تو ایسی تعلیم کا کیا فائدہ!

زیرنظر کتاب جو فاضل مصنف کے مختلف اوقات میں لکھے اور پڑھے گئے چھ مقالات کا مجموعہ ہے، میں انہوں نے تعلیم اور تہذیب کے اسی باہمی تعلق کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ چنانچہ حرف آغاز کے تحت موصوف رقم طراز ہیں:

> ”ہم نے تعلیم کے موضوع پر آج تک جو کچھ لکھا اس میں سے یہ چند مضامین اس کتاب میں جمع کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین مختلف مواقع پر لکھے گئے تھے۔ بعض علمی مجالس میں پڑھے بھی گئے۔ ان کے عنوانات و موضوعات میں فرق ہے لیکن تمام مضامین میں ایک داخلی ربط پایا جاتا ہے۔ گویا ایک ہی سلسلے کی کڑی ہیں۔ ان میں تعلیم کی حقیقت اور اس کے اصل وظیفے کی نشاندہی بھی ہے اور اس اَلمیے کا تذکرہ بھی جو تعلیم کو قومی تقاضوں اور

☆ ریسرچ ایسوسی ایٹ، ادارہ تحقیقات اسلامی، بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

اعتقادات و نظریات سے ہم آہنگ نہ کرنے کی وجہ سے رونما ہوا ہے''۔ ص۱۲۔

مصنف کے جمع کردہ ان چھ مقالات کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں:

۱۔ انسان سازی یا انسان سوزی

۲۔ تعلیم یا تدریس

۳۔ تعلیم اور تہذیب و ثقافت کا تعلق...... مولانا مودودیؒ کی نظر میں

۴۔ تباہی ہے اس قوم کے لیے جس سے اس کی زبان چھن گئی

۵۔ استاد کمرۂ جماعت میں

۶۔ تدریسِ اردو...... مشکلات و مسائل اور ان کے حل کی تدابیر

پہلے مقالہ یعنی ''انسان سازی یا انسان سوزی'' میں مصنف نے بنیادی طور پر مغربی نظام تعلیم اوراس کی 'اسلام کاری' یا اس میں اسلامی پیوندکاری اور اس سے پیداہونے والے بعض مضر اَثرات کوہدفِ تنقید بنایا ہے۔ پوری کتاب میں اپنے موضوع پر ان کا یہی مقالہ ہمارے خیال میں سب سے جاندار ہے اور اس میں اٹھائے گئے بنیادی نکات دیگر مقالوں میں بھی مکرر دکھائی دیتے ہیں، اس لیے یہاں دیگر مقالہ جات کی نسبت اس پر ذرا تفصیل سے بات کی جائے گی۔

اس مقالہ کے آغاز میں تعلیم کے بنیادی مقصد یعنی 'انسان سازی' کا مفہوم واضح کرتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> ''ہم یہاں ''انسان سازی'' کی اصطلاح ''تخلیقِ آدم'' کے معنوں میں استعمال نہیں کر رہے ہیں۔ ہماری مراد یہ ہے کہ انسان کی تربیت کر کے اور مسلسل حکیمانہ اصلاحی کوششوں سے جہاں تک ممکن ہو سکے نفسانی اور اَخلاقی بگاڑ سے اسے پاک کیا جائے تاکہ اس کے اندر دبے ہوئے خیر کے جذبات کو اظہار کا راستہ ملتا رہے۔ اس کی شخصیت کے اندر پوشیدہ ان اعلیٰ انسانی خصوصیات کو اجاگر ہونے کا موقع ملے جو غلط رہنمائی، فاسد ماحول اور بری صحبت کی وجہ سے مضمحل ہو کر رہ جاتی ہیں۔ حیوانی میلانات سے اسے بچانے کا اہتمام ہو۔ اس کے نفس میں موجود جوہر انسانیت کو ٹھیک طرح سے پنپنے کے لیے سازگار فضا فراہم کی جائے۔ اس کے وہ پہلو جو خلافت و عبادت کے تقاضے پورے کرنے میں مددگار ہوتے ہیں نمایاں کیے جائیں اور ان پہلوؤں کا اِزالہ کیا جائے جن کی وجہ سے حیوانی داعیوں کو تقویت ملتی ہے''۔ ص۱۳۔

پھراس کے بعد مصنف نے انسان سازی کی اس ذمہ داری کو دو اِداروں کے کندھوں پر ڈالا ہے؛ ان میں سے ایک خاندان کا ادارہ ہے اور دوسرا تعلیم و تربیت کا۔ خاندانی نظام چونکہ ان کا موضوع نہیں، اس لیے انہوں نے اسے نظر انداز کرتے ہوئے مؤخرالذکر کی تفصیلات سپردقلم فرمائی ہیں اور اپنا نقطۂ نظر تفصیل سے پیش کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہمارا نظام تعلیم جو کبھی 'انسان سازی' کا ذمہ دار تھا، اب اپنی اس ذمہ داری سے گویا سبکدوش ہو چکا ہے اور اس کی وجہ موصوف مغربی نظام تعلیم کی اندھی تقلید قرار دیتے ہیں، مصنف کے بقول:

> ''یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ گزشتہ تقریباً ڈیڑھ سو سال سے عالم اسلام میں تعلیم کا شعبہ اپنی اصل ذمہ داری سے غافل ہی نہیں بلکہ منحرف چلا آرہاہے۔ بناؤ سے زیادہ اس میں بگاڑ کا عمل جاری ہے۔ ایسا بدیسی مال تیار کر رہا ہے جو دوسروں کے آرڈر پر بنتا اور ہمارے حوالے ہوتا ہے۔ اس مال کے سانچے مغرب سے آتے ہیں اور ان سانچوں میں جو مال ڈھلتاہے وہ مغرب ہی کے کام کا ہے۔ ہمارے معاشروں میں اہل مغرب اس مال کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کرتے ہیں۔'' ص۱۷۔

مصنف یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ ''مغربی استعمار کو ایسا مال تیار کرانے کی ضرورت کیوں پیش آئی تھی؟'' پھر اس کے جواب میں انہوں نے ہندوستان میں مغربی استعمار کی صدی بھر کی تاریخ، اسلام اور اہل اسلام کے خلاف ان کی سازشوں،مستقبل کے حوالے سے ان کے منصوبوں، بالخصوص نظام تعلیم کے حوالے سے لارڈ میکالے وغیرہ کی اصلاحات و تجاویز کو چند صفحات میں سمو دیاہے اور آخر میں مغربی نظام تعلیم کے ایک بڑے ناقد شاعر اکبر اللہ آبادی کا یہ مشہورِعام شعر نقل کیاہے:

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

مصنف نے مغربی نظام تعلیم اور اس کی اسلام کاری کے حوالے سے زیر نظر کتاب میں جو اعتراضات اٹھائے ہیں، وہ حسب ذیل ہیں:

۱۔ جس نظام تعلیم پر ہمیں اعتراض ہے، جن تعلیمی اداروں پر ہم تنقید کرتے ہیں اور جس نصاب کی بے مقصدیت اور ضرر رسانی کی ہمیں شکایت ہے، ان کے مزاج کے اندر بڑی مہارت سے اور بہت گہرائی تک دین بے زاری کا زہر بھر دیا گیا ہے۔ اسلامیات کا مضمون داخلِ نصاب کیے جانے اور متعدد ایسی سرگرمیوں کے متعارف ہونے کے باوجود جن کو دینی سرگرمیوں کا نام دیا جاتا

ہے، زیر سطح اس نظام کی دین کے ساتھ کشمکش جاری رہتی ہے۔ چنانچہ نہ صرف یہ کہ طلبہ و طالبات کو سچا، پکا اور کھرا مسلمان بنانے میں یہ مددگار ثابت نہیں ہوتا ہے، الٹا گھر کے ماحول اور کچھ دوسرے عوامل کی کار فرمائی سے نونہالوں کے دل و دماغ پر دین کے جو اثرات ہوتے ہیں وہ بھی دھو ڈالتا ہے۔ ایمان کی قدر و قیمت اور اسلام کی عظمت دلوں میں بٹھانے کے بجائے یہ اسے مٹا دیتا ہے۔ ص۲۵۔

۲۔ اخلاق شخصیت کا وزن بڑھاتا اور آدمیت کے جوہر کو چمکاتا ہے۔ تعلیمی ماحول میں جن شخصیات کی اٹھان ہوتی ہے اور جو علم و معرفت کی دولت سے مالا مال ہو کر نکلتی ہیں ان سے اخلاق کی پاکیزگی اور بلندی کی سب سے زیادہ توقع کی جاتی ہے۔ ایک تعلیم یافتہ اور ایک ان پڑھ آدمی میں صرف یہی فرق نہیں ہوتا کہ ایک کتابیں پڑھ لیتا ہے اور دوسرے کو پڑھنا نہیں آتا، ان کا اصل فرق رویوں، سوچ اور فکر، اظہارات اور طرز عمل سے ظاہر ہوتا ہے۔ پڑھے لکھے انسان کے انداز و اطوار سے شائستگی اور تہذیب کا مظاہرہ ہوتا ہے جب کہ جاہل اور ان پڑھ آدمی اپنے طور طریقوں، اپنی بول چال اور اپنی حرکات و سکنات سے پہچانا جاتا ہے کہ اس میں اخلاق و کردار کی خصوصیات نہیں ہیں اور وہ نیکی اور اچھائی کا شعور نہیں رکھتا ہے۔ یہ ہماری معاشرت کا ہمیشہ سے اصول چلا آ رہا ہے...... اب صورت حال ایسا پلٹا کھا چکی ہے کہ جاہل اور ان پڑھ سکولوں اور کالجوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لچھن دیکھ کر اسے قرب قیامت کی نشانی سمجھتے اور توبہ توبہ کرتے ہیں۔ لچر زبان اور بے ہودہ حرکتیں اس نسل کی پہچان بن گئی ہے۔ کسی بس یا ویگن میں کالجوں کے چند لڑکے سوار ہو جائیں، کسی تقریب میں وہ آ گھسیں، کسی بس اسٹاپ، پارک یا تفریح گاہ میں جمع ہو جائیں تو ان کی گری ہوئی حرکتوں سے، ان کے طالب علم ہونے کا پتہ چل جاتا ہے۔ ایضاً، نیز: ص ۲۶۔

۳۔ مروجہ نظام تعلیم کا سب سے بڑا ستم یہ ہے کہ یہ عقلِ انسانی کو اس کے اصل وظیفے سے معطل کر کے اس کام میں لگاتا ہے جو بالکل ایک ضمنی کام ہے...... ہمارے تعلیمی اداروں میں درس و تدریس کی تمام سرگرمیوں کا محور دنیا ہوتی ہے۔ موت کے بعد والے مرحلے کی فکر ان سرگرمیوں سے پیدا نہیں ہوتی۔ شعور کا سفر اس رخ پر ہوتا ہی نہیں ہے جہاں سے آخرت کی طرف راستہ جاتا ہے۔ ص ۲۷۔

۴۔ مروجہ نصاب کی تعلیم اور مراحلِ تعلیم کی تکمیل سے طلبہ و طالبات اور ان کے والدین کی جو امیدیں وابستہ ہوتی ہیں وہ سب مادی فوائد سے تعلق رکھتی ہیں۔ آج کا طالب علم حصول تعلیم

میں جو مغز ماری کرتا ہے اس کی غرض سائنس، ریاضی، کامرس کے مضامین میں اچھے نمبر لانا ہے تاکہ وہ ڈاکٹر، انجینئر، کمپیوٹر کے فن میں کامل یا معاشیات کے شعبوں کا ماہر بن کر ایسا روزگار حاصل کر سکے جو اس کے شاندار مستقبل کی نوید لائے۔ تعلیم اس کے لیے ایسی فیکٹری یا کارخانہ ثابت ہو جہاں سرمایہ کاری کرنے والا کم سے کم مدت میں چند ہزار کمانے کے خیال سے پیسہ لگاتا اور جلد از جلد لگائے ہوئے پیسے سے کہیں زیادہ اسے لوٹنے لگتا ہے۔ سائنس، ریاضی، کمپیوٹر یا کامرس وغیرہ کے مضامین کے ساتھ اسلامیات، اردو، مطالعۂ پاکستان جیسے لازمی مضامین جو ملک و ملت کے ان سپوتوں کو زبردستی پڑھنے پڑتے ہیں، وہ اگر ان کی صوابدید پر چھوڑ دیئے جائیں اور انہیں اختیار دے دیا جائے کہ چاہیں تو پڑھیں اور نہ چاہیں تو نہ پڑھیں تو شاید پانچ فیصد طلبہ و طالبات بھی ایسے نہ نکلیں جو ایسے مضامین کو پڑھنے کی خواہش ظاہر کریں۔ وجہ ظاہر ہے کہ ان مضامین کی عملی زندگی میں کسی افادیت کا ان کے ذہنوں میں کوئی تصور نہیں ہے۔ موجودہ نظام تعلیم لطیف جذبات کی آبیاری، دینی معلومات میں اضافے اور تاریخی واقعات کے شعور کو کچھ زیادہ اہمیت نہیں دیتا ہے۔ ص ۲۹، ۳۰۔

۵۔ نصب العین کے اعتبار سے دیکھا جائے تو تعلیم جدید کا یہ پورا سلسلہ مرغوبات، شہوات اور خواہشاتِ نفس کا ایک ایسا جال ہے جس میں نئی نسلوں کو پھانسا جاتا ہے۔ جن نسلوں کے آباء و اجداد غیرت و حمیت کے پیکر تھے، پہاڑ جیسے بلند کردار اور چٹان جیسی مضبوط سیرت کے مالک تھے...... دنیا کو وہ برتتے ضرور تھے لیکن اس کی غلامی کو وہ اپنی مومنانہ شان کے خلاف سمجھتے تھے، ضرورتیں پوری کرنے کو حرام نہیں سمجھتے تھے لیکن نفس کے گھوڑے کی لگام ہمیشہ انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی...... تعلیم جدید کے اثر سے بزرگوں والا رنگ تو سارا اڑ گیا ہے لیکن حرص و آز نے دلوں میں جگہ پکڑ لی ہے۔ دولت کی پرستش کا سبق عمل میں آنے لگا ہے۔ جنسی جذبوں سے مغلوبیت بڑھ گئی ہے۔ نفس کے باغی اور سرکش رجحانات کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے گئے ہیں۔ عیش و نشاط کی چند گھڑیوں کی جستجو میں خوف خدا کے احساس سے جان چھڑا لی گئی ہے۔ ہدایت کی روشنی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے۔ یادِ خدا کے مواقع ہاتھ سے نکلنے لگے اور گمراہی کے راستے پر قدم تیزی سے پڑنے لگے ہیں۔ ص ۳۱، ۳۲۔

۶۔ نسل نو کے معنوی قتل کی متعدد صورتوں میں ایک یہ بھی ہے کہ اس کا رشتہ اپنے شاندار ماضی سے کاٹ دیا گیا ہے۔ یہ نسل اپنے بزرگوں کی عظمت سے نا واقف ہے۔ اس کو اپنے آباء و اجداد کے قابل فخر کارناموں کی کچھ خبر نہیں ہے۔ یہ اپنی اسلامی تاریخ کے زریں ابواب کا علم

نہیں رکھتی ہے۔ اس نسل کے بچے فلمی ستاروں سے واقف ہیں۔ کرکٹ اور فٹ بال کے میچوں کی ساری تاریخ ان کو اَزبر ہے۔ کھلاڑیوں کے شجرہ نسب اور مختلف میچوں کی خاص خاص باتوں کو انہوں نے ذہن نشین کر رکھا ہے۔ اپنے ہی ملک کے نہیں یورپ اور امریکہ اور بھارت کے ناچنے گانے والے مردوں اور عورتوں کے جملہ کوائف سے یہ نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ ان کے نغمے ان کی زبان پر جاری رہتے ہیں۔ انگریزی موسیقی کے اتار چڑھاؤ کی یہ کامیاب نقل کر لیتے ہیں۔ رقص کی بھی ان میں سے بہتوں کو خوب مشق ہے۔ ادھر دوسری طرف اپنی تاریخی معلومات کا یہ عالم ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے گھرانے کے بارے میں یہ نہیں جانتے کہ حضورؐ کی بیویوں کے کیا نام تھے اور بیٹیاں کتنی تھیں اور ان کے نام کیا تھے۔ ممتاز ترین صحابہ کے بارے میں ان کی آگہی صفر سے بلند نہیں ہے۔ تاریخ اسلام کے مشہور ترین کردار ان کے لیے اجنبی اور انوکھے ہی نہیں بلکہ بے معنی و گمنام ہیں۔ تحریک پاکستان کے نامور قائدین کا ان کو کچھ پتہ نہیں ہے۔ اسلامی کیلنڈر کے مہینوں کے نام ان کو نہیں آتے؟ ص ۳۳۔

۷۔ درسگاہوں میں زیرِ تعلیم نو نہالوں کے معنوی قتل کا ایک پہلو یہ ہے کہ ان کے دلوں سے بزرگوں کا احترام نکل گیا ہے۔ ہمارے تہذیبی رویوں میں اس احترام کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس جذبے سے خالی انسان کو مسلم معاشرے کا فرد تسلیم نہیں کیا جاتا ہے۔ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''جس شخص کے دل میں ہمارے چھوٹوں کے لیے شفقت کے جذبات نہ ہوں اور جو ہمارے معاشرے کے بزرگ اور عمر رسیدہ انسان کے شرف و احترام کا خیال نہ رکھتا ہو وہ ہم میں سے نہیں ہے'' ...... آج یہ المناک صورت حال اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ نئی تعلیم کے اثر سے اولاد کے دلوں سے والدین کی قدر و منزلت بڑی حد تک زائل ہو چکی ہے۔ مغربی معاشرے کا موجودہ ڈھانچہ مادیت پر کھڑا ہے۔ انسانی رشتوں تک کے لیے اسی مادہ پرستی کو معیار بنا کر ان کی اہمیت و افادیت کا تعین کیا جاتا ہے۔ ص ۳۵۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی تہذیب میں جہاں فاسد عناصر ہوتے ہیں، وہاں کچھ صالح عناصر بھی ضرور ہوتے ہیں اور اسلام ایک ایسا دین ہے جو دیگر تہذیبوں سے تفاعل کی صورت میں خذ ما صفا ودع ما کدر کا قائل ہے۔ ایسی صورت میں مغربی تہذیب ہو یا کوئی اور تہذیب، اس کے فاسد عناصر کی نشاندہی کرتے ہوئے صالح عناصر سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی، مگر افسوس کہ فاضل مصنف نے اس سلسلہ میں یک طرفہ موقف کی نمائندگی کی ہے یعنی ان کے ہاں مغربی نظام تعلیم کی خامیاں اور کمزوریاں تو بہت ہیں مگر خوبی شاید کوئی بھی نہیں۔ ظاہر ہے ان کے اس موقف سے فہم و

بصیرت رکھنے والے اتفاق نہیں کریں گے۔

دوسری بات یہ کہ انھوں نے مغربی نظام تعلیم کو تہذیب و اخلاق کا دشمن قرار دیا ہے، اور اس سلسلہ میں اپنے موقف کو مضبوط کرنے کے لیے مغرب کی اباحت پسندانہ سوچ کو دلیل اور نمونے کے طور پر پیش کیا ہے جن میں سے بعض اقتباسات ہم نے قصداً ذکر نہیں کیے، مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر فحاشی، بے حیائی، مادر پدر آزادی اور اسی نوع کی چند چیزیں جو یقیناً محل نظر ہیں، نکال دی جائیں تو پھر اخلاقیات کی صف میں اہل مغرب کا پلہ آج کے نام نہاد مسلمانوں سے بہت بھاری دکھائی دے گا۔ کیا ایسا نہیں ہے کہ امانت و دیانت، صداقت، صاف گوئی، اصولوں کی پاسداری، قانون کی بالادستی، وغیرہ میں وہ لوگ ہم سے بہت آگے ہیں۔ ان کے ہاں رشوت، کرپشن، جھوٹ، خیانت، قانون شکنی وغیرہ کی وہ مثالیں شاید ہی کبھی نظر آتی ہیں جو ہمارے ہاں روز جلوہ گر ہو رہی ہوتی ہیں۔ سوال یہ ہے کہ اگر نظام تعلیم ہی اخلاقیات کا دشمن ہے تو پھر یہ دشمنی صرف مشرق ہی میں کیوں، خود اہل مغرب اس کا شکار کیوں نہیں۔ نیز اگر یہی بات ہوتی تو پھر دینی تعلیم کے مدرسوں سے نکلنے والی کھیپ جو مغربی نظام تعلیم کی نہیں بلکہ الف تا یا مذہبی نظام تعلیم ہی کی پروردہ ہے، تو کم از کم اس سے مستثنیٰ ہونی چاہیے تھی مگر کیا مجموعی طور پر ایسا ہی ہے؟ کیا آج انہیں اخلاقیات کے عملی پیکر اور اعلیٰ نمونہ کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے......؟!

مغربی نظام تعلیم کا ناقدانہ جائزہ لینے کے ساتھ مصنف کو مشرقی نظام تعلیم اور فی زمانہ دونوں کی حدود اور ضرورت و اہمیت کے حوالے سے بھی جائزہ لیناچاہیے تھا مگر اس پہلو سے یہ کتاب تشنہ ہے اور ہمارے خیال میں یہ موضوع اس وقت تک ناقص رہے گا جب تک ان دونوں پہلوؤں پر طبع آزمائی نہ کی جائے گی اور محض تنقید کر دینے سے یہ حق پورا نہ ہو گا بلکہ ضروری ہے کہ حل (Solution) بھی پیش کیا جائے اور کوئی شک نہیں کہ اسلام سے مخلصانہ لگاؤ رکھنے والے دانش وروں کے لیے یہ آج کا بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس کے جواب میں محض یہ کہہ دینا کہ ''نظام تعلیم غلط ہے، اس کا قبلہ درست کیا جائے'' سے بات نہیں چلتی!

دوسرامقالہ ''تعلیم اور تدریس'' کے بارے میں ہے۔ اس میں مصنف نے ان دونوں لفظوں پر لغوی و اصطلاحی بحث کی ہے اور یہ نتیجہ نکالا ہے کہ تدریس کا معنی ہے: پڑھانا، سکھانا، رٹانا اور یاد کرانا۔ جب کہ تعلیم کا مطلب ہے فکری و عملی تربیت کرنا اور تہذیب سکھانا۔ تدریس اورتعلیم میں فرق کے ضمن میں مصنف نے جو مباحث اٹھائے ہیں، ان کے مطالعہ سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ

انہوں نے اس سلسلہ میں قدرے تکلف سے کام لیا ہے، اور اس کی وجہ غالبًا یہی ہے کہ وہ اس فرق کی بنا پر اپنا مدعا 'یعنی مغربی نظامِ تعلیم کی خرابیاں' ثابت کرنا چاہتے ہیں جو اس فرق کو ثابت کیے بغیر بھی وہ کر سکتے تھے اور پہلے مقالہ میں انہوں نے فی الواقع کیا بھی ہے اور یہی چیز ان کی کتاب کا مرکزی موضوع ہے، چنانچہ اس مقالہ کے آخر میں بھی انہوں نے اپنی تنقید و اعتراضات کو دہرایا ہے اور اکبر الٰہ آبادی کے یہ اشعار اپنے موقف کی تائید میں پیش کیے ہیں:

کچھ منع نہیں ہر قسم کی تحریر پڑھو
لیکن قرآن کی بھی تفسیر پڑھو
قلزم کی تہہ ٹٹولو یا ائیر شپ میں جھولو
جب بھی یہی کہوں گا اللہ کو نہ بھولو
حاصل کرو علم طبع کو تیز کرو
باتیں جو بری ہیں ان سے پرہیز کرو

ص ۶۶۔

زیرِ نظر کتاب کے تیسرے مقالہ کا عنوان ہے: ''تعلیم اور تہذیب و ثقافت کا تعلق...... مولانا مودودیؒ کی نظر میں''۔ اس مقالہ میں مصنف نے مولانا مودودیؒ کی ایک مختصر کتاب 'تعلیمات' کے حوالے سے مغربی نظامِ تعلیم کے سلسلہ میں ان کے افکار و نظریات کا ایک مختصر تجزیاتی مطالعہ پیش کیا ہے، اس مقالہ کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ مصنف نے پہلے مقالہ میں جو کچھ تحریر کیا ہے، وہ دراصل مولانا مودودیؒ ہی کے افکار کی بازگشت ہے۔ بہرحال اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے یہ حصہ بھی یقیناً لائقِ مطالعہ ہے۔

کتاب کے چوتھے مقالہ کا عنوان ہے: ''تباہی ہے اس قوم کے لیے جس سے اس کی زبان چھن گئی''۔ اس مقالہ میں مصنف نے پاکستانی نظامِ تعلیم میں اردو سے بے توجہی کو موضوعِ بحث بنایا ہے۔ انگریزی اور اردو زبان کی اہمیت یا عدمِ اہمیت کے حوالے سے مسلمانانِ ہند میں بہت حد تک اختلافِ رائے رہا ہے۔ ایک طبقہ ایسا تھا اور اب بھی ہے، جو اردو زبان کو مذہبی تقدس دینا چاہتا ہے اور یہ رائے رکھتا ہے کہ اردو زبان ہی کو اوڑھنا بچھونا بنایا جائے، نیز یہ طبقہ انگریزی زبان کو 'کافرانہ زبان' متصور کرتے ہوئے اسے حرامِ مطلق قرار دیتا ہے۔ جب کہ ایک طبقہ ان کے برعکس اردو کو ترقی کی راہ کا 'روڑا' سمجھتا ہے۔ جب کہ ایک طبقہ شروع سے ان دونوں کے درمیان اعتدال کے نقطہ پر قائم رہا ہے۔ مصنف کے زیرِ نظر عنوان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاید وہ بھی انگریزی کو حرامِ مطلق سمجھتے

ہوں گے مگر ایسا نہیں ہے بلکہ ان کے ہاں ایک معتدلانہ موقف پایا جاتا ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''ان رنگارنگ زبانوں میں سے خالق نے کسی زبان کو کافر یا مسلمان قرار نہیں دیا ہے۔ ہر زبان اس کے پیغام، اس کے سچے دین کی دعوت اور اعلیٰ انسانی اقدار اور پاکیزہ اخلاقی اور روحانی تعلیمات کو پھیلانے کا ذریعہ بن سکتی ہے۔ ہر زبان تمدن کی خادم بن کر دکھا سکتی ہے۔ ہر زبان سے تہذیب و ثقافت کے فروغ کا کام لیا جا سکتا ہے۔ تمام زبانیں علوم و فنون کو پھیلانے کی خدمت انجام دی سکتی ہیں.......... تعصب کی بنیاد پر زبانوں کی کافری اورمسلمانی کا فتویٰ دینا کوئی معقول روش نہیں ہے۔ دوسری زبانوں کا سیکھنا نہ عیب ہے اور نہ کسی طرح کا گناہ۔ ڈاکٹر حمیداللہ عثمانیہ یونی ورسٹی حیدرآباد دکن کی پیداوار تھے لیکن دنیا کی سات بڑی زبانوں پر عبور ان کے لیے عار نہیں بلکہ حد درجہ باعثِ افتخار تھا۔ یورپ کی تین زبانوں کے علاوہ ترکی زبان میں بھی وہ مہارت رکھتے تھے۔ لیکن اس ضمن میں اہم اور قابل غور بات یہ ہے کہ فرانسیسی، انگریزی، اور جرمنی و ترکی پر ان کا ماہرانہ عبور ان زبانوں کی قیمت پر نہ تھا جن کو السنۂ شرقیہ سے بڑھ کر اسلام کی زبانیں تصور کیا جائے تو بے جا نہ ہو گا۔ وہ عربی، فارسی اور اردو میں عالمانہ سطح کا درک رکھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ اورمولانا محمد علی جوہرؒ کی انگریزی دانی سے کون واقف نہیں۔ لیکن ساتھ ہی اپنی زبانوں میں مہارت تامہ کے اعتبار سے ان کی امتیازی شان سے کوئی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا''۔ ص ۱۰۶، ۱۰۷۔

گویا مصنف کو اعتراض اس بات پر نہیں کہ انگریزی یا دیگر زبانیں نہ سیکھی جائیں بلکہ اس بات پر ہے کہ دیگر زبانوں کو سیکھنے کی یہ صورت نہ ہو کہ اپنی اردو زبان کو بھلا دیا جائے اور اسے فنا ہونے کے لیے حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جائے اور وہ ایسا کسی قومی یا علاقائی تعصب کی بنیاد پر نہیں کہتے بلکہ اس کے پیچھے ان کی یہ سوچ کار فرما ہے کہ اس زبان میں ہمارا بہت بڑا دینی ورثہ محفوظ ہے، ہمارے عقائد و نظریات اور تہذیب و تمدن کے مختلف مظاہر کی یہ مرہون منت ہے، چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ ''یہ وہ زبان ہے جس میں عربی کے بعد سب سے بڑا دینی اور تہذیبی و ثقافتی سرمایہ محفوظ ہے''۔ ص ۱۱۰۔

اس بات میں کوئی شک نہیں کہ زبان کسی بھی قوم کے تہذیب و تمدن اور عقائد و افکار کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ مصنف نے اسی بنیاد پر یہ نتیجہ نکالا ہے کہ اگرآپ اپنی نسل نو کو اردو سے بالکلیہ محروم کر کے انگریزی زبان کے سپرد کر دیں گے تو اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ''ان پراپنے کلچر اور اپنی تہذیبی

روایات سے واقفیت کے دروازے ہم اپنے ہاتھ سے بند کر رہے ہیں۔ صرف ایک اس تہذیب و ثقافت کے دروازے اپنی نسلوں کے لیے کھلے چھوڑ رہے ہیں جس کی نمائندگی انگریزی زبان کر رہی ہے۔ اپنی قوم، اپنے ماضی کی عظمت و افتخار، اپنے علمی سرمائے، اپنے معاشرتی نظام اور اپنے اخلاقی معیارات کی ساری خوبیوں پر اپنی زبان سے ناواقفیت کے ذریعے گہرے پردے اپنے ہاتھ سے ڈال رہے ہیں''۔ ص۱۱۸۔

زیر نظر کتاب کا پانچواں مقالہ فنِ تدریس سے تعلق رکھتا ہے۔ مصنف نے اس کے لیے یہ عنوان پسند کیا ہے: ''استاد کمرۂ جماعت میں''۔ اس میں انہوں نے استاد و معلم کے لیے اس کے پیشے کی اہمیت اور خود اس کی ذمہ داری پر روشنی ڈالی ہے اور بہت ہی اچھے انداز میں معلم کے وظائف واضح کیے ہیں۔ اس سلسلہ میں معلم کے لیے ان کے پیش کردہ درج ذیل تین نکات مرکزی حیثیت رکھتے ہیں:

۱۔ پہلی چیز یہ ہے کہ وہ اپنے اخلاق و کردار کے اعتبار سے اتنا بلند ہو کہ طلبہ اسے اپنے لیے ایک نمونہ تصور کر سکیں۔ معاشرے کو یہ یقین ہو کہ وہ نئی نسلوں کو اخلاقی و عملی بگاڑ میں مبتلا نہیں کرے گا۔......

۲۔ دوسری چیز یہ ہے کہ وہ اپنے پیشے کی اہمیت سے اچھی طرح آگاہ ہو۔ اس کے تقاضے سمجھتا ہو۔ اس کے اندر اپنی منصبی ذمہ داریوں کا پورا شعور ہو۔ اسے احساس ہو کہ کسی فیکٹری اور کارخانے کے مزدور کے مقابلے میں اس کے کام کی نوعیت یکسر مختلف ہے۔ فیکٹری اور کارخانہ انسانی ضرورت کی مختلف اشیاء تیار کرتا ہے۔ جبکہ استاد خود انسان کی شخصیت کی تشکیل، اس کی سیرت کی اصلاح و تعمیر اور اس کے کردار کی تراش خراش کے عمل پر مامور ہوتا ہے۔......

۳۔ تیسری بات یہ ہے کہ جو مضمون بھی پڑھانے جا رہا ہو اس پر مکمل عبور رکھتا ہو۔ اس مضمون میں طلبہ کی بہتر رہنمائی اور مدد کرنے کی اس میں پوری اہلیت ہو۔ مضمون پر عبور کے ساتھ ساتھ تدریس کے طریقوں کا اسے کماحقہ علم ہو''۔ ص ۱۴۲، ۱۴۳۔

اس سارے مقالے میں اسی نوعیت کی فنی تفصیلات زیادہ ہیں، البتہ ایک جگہ انہوں نے استاد کو مداری سے تشبیہ دی ہے جو غیر مناسب دکھائی دیتی ہے، مثلاً لکھتے ہیں:

''استاد کو اپنی جماعت کے اندر جتنا چوکس اور متحرک ہونا چاہیے اس کے لیے کسی نے مداری کی مثال دی ہے، جو اپنی بانسری اور ڈگڈگی کا جادو جگاتا، مجمع کی نفسیات پر اثر ڈالنے والے بول بولتا، بچے جمورے کو اور اپنے بندر اور بکری کو کرتبوں کے لیے حرکت

میں لاتا، راہ چلتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کر کے اپنے گرد جمع کر لیتا ہے۔ اکٹھے ہونے والے لوگوں کے شوق تماشا کو ہوا دیتا ہے''۔ ص ۱۴۶۔

یہی نہیں بلکہ مصنف نے مداری اور بچے جمورے کے پورے کھیل کو بھی قلم بند کیا ہے۔

چھٹا مقالہ یعنی ''تدریس اردو...... مشکلات و مسائل اور ان کے حل کی تدابیر'' مکمل طور پر فنی نوعیت کا ہے جس سے اردو کے اساتذہ یقیناً فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

کتاب کی پروف خوانی پر خصوصی توجہ دی گئی ہے۔ غلطیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ کتابت خوبصورت اور سرورق دیدہ زیب ہے، مگر کاغذ کافی ہلکا اور قیمت قدرے زیادہ ہے۔

ادارہ تحقیقات اسلامی کی منفرد علمی پیشکش

مسلم معاشرہ کی تاسیس و تشکیل

ڈاکٹر صاحبزادہ ساجد الرحمٰن

صفحات : 234 قیمت : 125.00 روپے

زیر نظر کتاب میں صدر اسلام کے سیاسی' سماجی' معاشی اداروں کی تاسیس و تشکیل کا دور جاہلیت کے تناظر میں جائزہ لیا گیا ہے' اور اس امر پر بحث کی گئی ہے کہ اسلام نے انسانی زندگی کے کن کن شعبوں کو متاثر کیا۔ ماضی کے کن عناصر کو حرف غلط کی طرح مٹا ڈالا اور کن عناصر کو مہلت حیات دی۔ بحث کا مرکزی نکتہ یہ ہے کہ عہد نبوی اور عہد خلفائے راشدین میں کس طرح ایک خدا پرستانہ معاشرہ کی داغ بیل ڈالی گئی جو اپنے اصولوں کے بارے میں کسی مصالحت کا روادار نہ تھا۔ اس نے اقدار و تصورات کی نئی دنیا تشکیل دیتے ہوئے انسانی فکر و عمل کے منہاج میں کیا کیا تغیرات پیدا کئے اور دور جاہلیت کے سیاسی' معاشی اور سماجی اداروں سے کہاں کہاں اور کس طرح استفادہ کیا۔

کتاب یہ جاننے میں مدد دیتی ہے کہ مسلم معاشرہ ارتقائی منازل طے کرنے کے سفر میں غیر مسلم معاشروں سے کس حد تک استفادہ کر سکتا ہے۔

ملنے کا پتہ:۔ ڈائریکٹر مطبوعات ادارہ تحقیقات اسلامی (بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی)
پوسٹ بکس نمبر 1035۔ اسلام آباد 44000 ۔ فون نمبر 254874